مجید امجد کی نظم ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

ABSTRACT:

This poem by Majeed Amjad has been termed as a representative piece of creativity by the critiques of Urdu literature students of poetry alike. And rightly so, because on the one hand, it tends to explore and unfold the multi-layer complexities of life: present here after and here before in a semi metaphoric style but also transcends the reader into the mystery of time, space and universe. The ease and eloquence with which Majeed Amjad has woven the fabric of this poem is unprecedented in modern Urdu poetry. Another mentionable dimension of this novel poem is the metaphorically of man, who despite ostensible freedom of choice is miserably bound by the chains of fate and compulsions, both internal and external. The comprehension of rich poetic expression, the sublime magic and delicate knitting of lines with its theme, has placed this poem among the evergreen pieces of eternal poetry.

کہنے کو تو یہ ایک نظم ہے، لیکن نظم کے پردے میں ایک معنی در معنی جہانِ آرزو ہے جس کے ڈانڈے وقت ،کائنات اور خُدا کی تکوین میں انسان کی حیرت بھری تلاش سے جا ملتے ہیں ۔اُوپری سطح پر نظم کے عنوان سے یہ مغالطہ قاری کے احساس کو لاحق ہوسکتا ہے کہ نظم کے پیرائے میں شاعر اپنے ملال اور اپنی نشاط کی رائگانی کا ماجرہ بیان کرنے کے در پے ہے، لیکن جوُں جوُں اِس نظم کی قرأت میں اِنہماک کریں تو ہم پر کُھلتا ہے کہ شاعر نے انتہائی فنی چابک دستی اور مطالعے کی بوقلمونی کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے اسفار کو پابندِ قلم کیا ہے جن کا بیان اُردو نظم میں خال ہی ملتا ہے ۔اِس معمورۂ حیرت میں جسِے ہم زمین کے نام سے معنون کرتے ہیں، انسان ایک غالب

اور فعال ترین کردار ضرور ہے، لیکن اِس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع و بسیط کائنات میں خُود انسان اور ارضی کُرے کی حیثیت کیا ہے؟ ایک بے چہرہ اور بے اثر اکائی سے زیادہ نہیں۔ وقت کی دُھند میں لپٹے ہوئے اسرارِ کائنات ہر گُزرتے دن کے ساتھ جس قدر منکشف ہوتے ہیں، اتنا ہی انسان کی جُستجو اور طلب کو مہمیز کرتے ہیں۔ ایسے میں مجید امجد ایسا شاعر ہے جو اپنی بے پناہ خلّاقی اور تیسری آنکھ سے اَن دیکھے مظاہر کی فکری اور فنی تجسیم پر غایت درجہ قادر ہے، قاری کی اُنگلی پکڑ کر اس چوتھی کھونٹ کا سفر آغاز کرتا ہے، جہاں نظریں خیرہ تو ہوتی ہیں مگر پتھراتی نہیں۔ آدمی حیرتی تو ہوتا ہے، مبہوت نہیں ہوتا۔ غمِ ذات کی پہنائیوں سے خُروج کرتا ہوا، یہ نظمیہ سفر بہت اندھے اور روشن موڑ کاٹ کر ایک حیات آفریں اختتامیے پر منتج ہوتا ہے، جہاں شاعر کا احساس اُس کا تخیّل اور قلم تمنّاؤں کے تصویر کدے میں نگران تقرر ہوتا ہے، لیکن چشمِ نگران کی یبوست اور بے فیضی کے ساتھ نہیں بلکہ بچے کی سی معصومیت کے ساتھ جو کھیلن کو چاند مانگتا ہے اور مٹی کے کھلونے کو زندگی کی حرارت سے معمور کر دیتا ہے۔ مذکورہ نظم میں مجید امجد نے اپنے تخلیقی تجربے کی ریزہ کاری کی ہے۔ اس نظم میں وہ گیت کا بھی آہنگ لے کر آئے ہیں، اُنھوں نے نظم کو بنے بنائے سٹرکچر سے نکالا ہے اور نظم کے آہنگ کو مختلف بحور کے استعمال سے نئے آہنگ سے ہم کنار کیا ہے اور اس میں میلوڈرامائی کیفیت بھی پیدا کی ہے۔ مذکورہ نظم بیک وقت گیت بھی ہے، مکالمہ بھی ہے اور میلوڈراما بھی ہے، جس میں کہانی بھی ہے، کردار بھی ہیں اور ڈرامائی عناصر بھی ہیں، جسے شاعر نغمۂ حیات کا ذیلی عنوان دیتا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور ذیلی عنوان شاعر کرۂ ارض'' کے نام تصنیف کرتا ہے اور اس لاسے (حیلے سے) یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ جدید نظم کی ساخت اور بُنت کسی ایک پیمانے تک محدود نہیں بلکہ اس میں اظہار اور کرافٹ کے نامانوس پیوند لگا کر جدید نظم کو یکساں طرزِ احساس و طرزِ بیان رکھنے والے فن پارے کی جگہ اُسے مختلف ٹکڑوں سے بنائے گئے دلکش موزائیک (Mozaic) کے طور پر بھی خلق کیا جا سکتا ہے۔ مجید امجد کی مذکورہ نظم کے فنی پہلوؤں میں متعدد اوصاف دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر کو لغت آفرینی میں کمال حاصل ہے، دوسرے یہ کہ نظم میں معانی کی تہ در تہ سطحیں شاعر کے استعاراتی و علامتی نظام پر دلالت کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نظم کا موضوعاتی ابعاد اپنی جگہ مختلف جہات کا حامل ہے۔ مجید امجد کو عمومی طور پر بطور جدید نظم گو شاعر کے زبان و بیان اور لغت پر بے مثال قدرت حاصل ہے۔ اُن کی نظم ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب'' کی بُنت اور تکنیک اپنے بطن میں انوکھے شاعرانہ امتزاج کی حامل ہے۔ اُنھوں نے فکر اور احساس کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنے مطالعاتی انجذاب کے بعد اس نظم کو خلق کیا ہے اور مذکورہ نظم کی تراکیب سازی، مصرع سازی اور استعاراتی ہنرمندی کا قرینہ اُن کے شعری سلیقے اور قرینے کا بیّن ثبوت ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ شاعر فکری و فنی اعتبار سے ترفع کے مقام پر فائز ہے۔ اُن کی یہ نظم بظاہر ذاتی ملال اور رائگانی سے شروع ہوتی ہے جس میں ایک فرد کی تنگ دستی، مجبوری و مہجوری کی منزل کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں اُسے اپنی تہی دامانی و بے دست و پا ہونے کا شدّت سے احساس ہے مگر جوں جوں نظم آگے بڑھتی ہے تو قاری پر کھلتا ہے کہ یہ ملال اور رائگانی کسی ذاتی محرومی کا شاخسانہ نہیں ہے بلکہ، وقت، کائنات اور خدا کی تکوین میں گھرے ہوئے آدمی کا حیرتی بیانیہ ہے جو سطر در سطر، منزل در منزل قاری کو نئی معرفتوں

اور نئے آشوبوں سے متعارف کرواتا ہے۔ پوری نظم اپنے عنوان سے بیک وقت متصل بھی ہے اور منحرف بھی۔ بظاہر تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ یہ رائگانی اور ملال کی نظم ہے، لیکن اصل میں نظم خالی ہاتھوں میں ارض و سما کی سیاحت کی نظم نہیں ہے، سو جیسے جیسے نظم کی گپھاؤں میں قاری داخل ہوتا ہے تو ہر گام پر ایک نئی حیرت، ایک نیا انکشاف اور ایک نئی جستجو قاری کا خیر مقدم کرتی ہے اور اسی للک میں قاری بہت سی نامانوس منزلوں سے اُس آسانی سے گزر جاتا ہے جو میلے میں آئے ہوئے کسی بچے کی سہولت کار ہوتی ہے کہ میلے میں داخل ہونے والے بچے کا اشتیاق میلے کے آخر میں اُس کا اضطراب بن جاتا ہے جو زندگی بھر اُس کو دغا نہیں دیتا۔ قاری بچے کی حیرت کے ساتھ اس نظم میں سفر کرتا ہے تو یہ نظم اُس پر کھلنا شروع ہو جاتی ہے:

کیا کہوں، کتنے غموں، کتنے غموں کی شکن آلود بساط
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رُکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بجھتی لپٹی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے
یہ مرا قصۂ غم کون سنے؟ کس کو سناؤں ___ کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں ___ جس کو
پیتے پیتے مری اک عمر کٹی ہے اِک عمر
دیکھتے ہو وہ جو اک جادۂ نورانی ہے
وہ جو اِک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سرِ بامِ بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند
وہ جو جھکتی ہوئی مڑتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا منصب انھی گلیوں کی نگہبانی ہے
وہ جو ہر شام انھی گلیوں میں کوئی مست سی لَے
بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں گھُل جاتی ہے
وہ خموشی، سفرِ شب کے تسلسل کی نقیب
جس کی میّت پہ اندھیروں نے رِدا تانی ہے(۱)

شاعر اپنے ماضی کی یاد کو آواز دے رہا ہے، معاشرے کے ایک تخلیق کار فرد کے ناتے اُسے زندگی کے اُلجھاووں میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فراغت نہیں ہے، لیکن اُسے ایک فرصت یک گام اداس کر دیتی ہے، فرصت کا یہ لمحۂ موجود اُسے ملول کر دیتا ہے۔ تخلیق کار تفکّر کی کیفیت میں ہے کہ ایک لمحہ جو میری مٹھی میں آیا تھا، وہ میرے ساتھ کیا کر گیا ہے:

آج بھی جب کہیں رستے میں، کسی موڑ، کسی منزل پر

کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خُرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لیے اُڑتا ہے سمٹتا ہے تو دھیرے دھیرے
کوئی لَے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تارِ بربط کی کوئی لرزشِ پنہانی ہے
جو شب و روز کے ایواں میں فُغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے، زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سُنتے ہو، کس کی یہ آواز ہے، پہچانی ہے؟(۲)

ہم اس لغزش پا کو اپنے تخّیل (imagination) کے زور پر متعین کر سکتے ہیں کہ اس ایک جذباتی لمحے کا کیا ہوا، کوئی ایک غلط فیصلہ یا کوئی ایک غلط قدم، اس کو استعاراتی انداز میں دیکھنا پڑے گا۔ وہ اپنے ایک لمحاتی فیصلے کی کجی کو celebrate بھی کر رہا ہے اور اس پر کمنٹ (Comment) بھی کر رہا ہے۔ وہ محبت کا لمحہ بھی ہو سکتا ہے وہ ہجر کا لمحہ بھی ہو سکتا ہے، وہ ایک ایسا لمحہ بھی ہو سکتا ہے، کہ وہ اپنے محبوب کو حاصل کر سکتا تھا لیکن جھجک میں رہ گیا۔ وہ اس لمحے کو قید نہیں کر سکا، سو لغزش پا کی کئی جہات ہو سکتی ہیں، لیکن ہمیں اس لغزش پا کو بعینہٖ لینا چاہیے۔ اس کی واقعاتی تفصیلات اگر ہم اپنے تخّیل (Imagination) کے زور پر متعیّن کریں گے تو ٹھوکر کھائیں گے:

یوں کب تک صبح و شام جلیں
بے سُود جلیں، ناکام جلیں
جب دُنیا والے سو جائیں
میٹھے سپنوں میں کھو جائیں
جب چلتے دریا تھم جائیں
تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آگ بجھے چوپالوں کی
جب آنکھ لگے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چمٹے ہوئے
سائے کی طرح سمٹے ہوئے
دو بھِک منگوں کے بھیس میں ہم
جا نکلیں اک اور دیس میں ہم

کچھ دور، اُفق کے پار، اُدھر
ہے ایک نیا سنسار، اُدھر
خوشیوں کی سنگاروں کی دُنیا
پھولوں کی بہاروں کی دنیا (۳)

مجید امجد نے یہاں بحر میں بھی تبدیلی کی ہے اور ایک کردار بھی تخلیق کیا ہے جو شاعر سے مکالمہ کرتا ہے اور نظم میں ڈرامائی کیفیت کو پیدا کرتا ہے۔ اس طرح شاعر نے ایک منظر کے اندر دوسرے منظر کو تخلیق کیا ہے اور مختلف کیفیات کو پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں شاعر کو زندگی کا گیان حاصل ہے جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ زندگی ایک مسلسل تگ و تاز کا نام ہے، جس میں انسان کو تمام مصائب و مسائل کا مقابلہ کر کے اپنے اندر توانائی پیدا کرنی ہے اور زندگی کو نا صرف گزارنا ہے بلکہ پُر امن بھی بنانا ہے اور انسانی دُکھوں کے ساتھ ساتھ سماجی غموں کا بھی مُداوا کرنا ہے اور اس دنیا کو انسانوں کی فلاح و بہبود کا بہترین مرکز بنانا ہے۔ ایک شاعر ہے اور ایک شاعر کا ہمزاد ہے یعنی ایک شاعر کا فزیکل سیلف (Physical Seif) ہے اور ایک اس کا تخیلاتی سیلف imaginative self ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بھِک منگ یوں ہیں، وہ اس طرح کہ ظاہر ہے کہ شاعر حُسن کی بھیک مانگتا ہے اور اس کا ہمزاد اور وہ اپنے خیالوں کی بھی بھیک مانگتا ہے اور وہ اپنے جہان آرزو کو Elaborate کر رہا ہے، یعنی دو جہان ہیں، ایک وہ جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے اور ایک وہ جو اُس کا جہان آرزو ہے، جس کے وہ خواب دیکھتا ہے، جس میں وہ جانے کی تمنا کر رہا ہے۔ ایک اس کی حقیقی دنیا ہے جس نے اسے زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور ایک وہ دنیا ہے جس کے وہ خواب دیکھتا ہے، وہ اس خوابوں والے اپنے نگر کی طرف جانا چاہ رہا ہے، کیوں نہیں جا پا رہا، یہ وہ اپنی اور اپنے ہمزاد کی جو محدودیت ہے اور جو محرومیاں ہیں یعنی محدودات Limitations ہیں، وہ دونوں کو Combine کر کے ایک Situation تخلیق کر کر رہا ہے۔ اس کے اندر جو عدم کارکردگی ہے، اس کے اندر جو ہمت کی کمی ہے وہ ناکردہ کاری کا بھی ساتھ ذکر کر رہا ہے۔ دنیا خوابوں سے کبھی خالی نہیں ہوتی اور کبھی وعدوں سے بھی خالی نہیں ہوتی، لیکن یہ ساری چیزیں یوں بے معنی ہیں کہ جو اس کی مجوزہ دنیا ہے اور وہ جو اس کے خوابوں کی دنیا ہے، وہ تو اس سے چھن گئی ہے یا جس میں دو پیار کرنے والوں نے عہد و پیمان کیے تھے مروجہ دنیا کے بندھنوں کو توڑ کر کسی اور خوشیوں کے دیس یا دیار میں جانے کے، شاید وہ پیمان بھی پورے نہ ہو سکے، اب اُسے اپنی کسی خطا پر پچھتاوا بھی ہے مگر مجید امجد کا کمال یہ ہے کہ اس کی مذکورہ نظم میں فرد کے ذاتی غم کو وہ آفاقی غم بنا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اس کا زندگی پر یقین متزلزل نہیں ہوتا، اگرچہ یہ زندگی بے مقصدیت سے عبارت ہے مگر تحرک سے تعبیر ضرور ہے۔ جیسا کہ حفیظ ہوشیار پوری نے کہا تھا:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

دنیا خوابوں سے، خیالوں سے، رعنائی سے خالی نہیں لیکن جو میرے حصے کی دنیا تھی، جو میرا خواب تھا، وہ

تتر بتر ہو گیا ہے۔ باقی معمورہ یہ آباد رہے، لیکن اس دنیا کا میں طالب نہیں ہوں جس کا میں طالب ہوں، وہ لمحہ میری مٹھی سے پھسل گیا ہے۔

یہ ideal اور حقیقی دنیا کے درمیان تضاد کی صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے کہ معمورۂ دنیا آباد ہے، اُس کی رونقیں آباد ہیں۔ رنگ و بوئے ہستی سب عناصر موجود ہیں، لیکن یہ دنیا میرے کسی کام کی نہیں۔ یہ دنیا اپنی رونقیں، ساری التفات اپنی ساری چیزیں رکھتی ہے۔

یہ دنیا التفات رکھتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں جس میں رنگ بھی لُبھاتے ہیں، جس میں رونقیں بھی ہیں۔ یہ دنیا میری نہیں ہے، میری دنیا تو لُٹ چکی۔ میری دنیا تو چھن چکی، اب یہ معمورہ آباد رہے نہ رہے، لیکن میں اس کا خریدار نہیں ہوں۔

ایک زمانی صورت حال اور ایک خیالی صورت حال کے درمیان کا جو خلا ہے کہ اس کی موعودہ دنیا اور ایک اس کی وہ دنیا خیالی دنیا ہے اور ایک وہ دنیا ہے جو آباد بھی ہے، جہاں ساری لذتیں تو ہیں، لیکن وہ دنیا کے لیے نہیں ہیں۔ شاعر یہاں خوابوں اور خیالوں کی دنیا اور موجود صورت حال کے درمیان تقابل کر رہا ہے اور اس تقابل میں اپنی رایگانی کا رونا رو رہا ہے، ’’ لیکن ‘‘ سے اس کی وہ دنیا شروع ہوتی ہے جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ اس کا سپنا ٹوٹ گیا جس خواب کی اسے تعبیر نہ مل سکی۔ دو دنیاؤں کا اس نے تقابل کیا ہے ایک وہ دنیا جو اُس کے سامنے ہے اور ایک وہ دنیا جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ یہاں رائگانی اس دنیا کی ہے جو اُس کی مٹھی سے نکل گئی ہے:

آج اُس فرصتِ یک گام کو روتا ہوں جب اک لغزشِ پا
چھین کر لے گئی مجھ سے وہ اُمنگوں سے چھلکتی دُنیا
آہ وہ دُنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
یوں تو آفاق میں دُنیاؤں کی ارزانی ہے
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں، خورشید بھی ہے، ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے
لیکن اک دُنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
جس کے ماتم میں مری چاک گریبانی ہے
میری سم خوردہ تمناؤں کی نظروں سے گُریزاں ہی رہی
لاکھ ڈھونڈا، مگر افسوس کہ اک رنجِ پشیماں نکلی
بوجھ بن کر مری تقدیر کی پلکوں پہ رہا
اب مرا دل ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
اب یہ دُنیا، یہ صدا کوش نصیبوں سے بھرے شہر و دیار
غموں خوشیوں کے جھمیلوں میں نہاتی ہوئی روحوں کا نکھار

مجھ سے پوچھو تو مرے سامنے اب یہ دُنیا
ورقِ مُصحفِ اندوہِ گراں جانی ہے (۴)

وہ دو دنیاؤں کا تقابل کر رہا ہے ۔ایک وہ دنیا جو اُس کی آئیڈیل دنیا ہے لیکن اسے حاصل نہ ہوسکی ۔ایک وہ دنیا جو اس کو حاصل ہوسکتی ہے ،لیکن وہ اسے اپنانا نہیں چاہتا ،وہ دنیا کی آسایشوں کا گاہک ہی نہیں ہے جو ترغیب دے کر اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہے۔ وہ اس دنیا کا طلب گار و خریدار ہی نہیں ۔وہ جس دنیا کا طلب گار ہے، وہ دنیا اس سے چھن چکی ہے ۔ اس کی طلب تو وہ دنیا ہے جہاں لالچ ، مکاری دھوکا نہ ہو اور ہوس نہ ہو۔ شاعر تو خواب دیکھنے والا ہوتا ہے اور ان خوابوں پر ہی ساری عمارت تعمیر کرتا ہے ، اپنے ارادوں کی ، اپنے خیالوں کی ، اپنے احساسات کی ۔ اپنے جذبوں کی ۔ یہ شاعر کا ترکیب سازی کا ہُنر ہے ۔ یہ وہ دنیا ہے جس کی اُسے چاہت اور طلب و طمع نہیں ہے، جس کا وہ طلب گار نہیں ہے ۔ایک دنیا کا وہ طلب گار ہے اور ایک دنیا کا وہ طلب گار نہیں ہے ۔'لمحۂ موجود' کی دنیا ۔ اس کا ایک ورق یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا ہر ورق شدید غم میں لپٹا ہوا ہے ۔ دو دنیائیں ہیں۔ ایک دنیا جو اُس کے خوابوں ، خیالوں ، تمناؤں کی دنیا ہے ، ایک دنیا جو دست یاب ہے ۔ وہ دو دنیاؤں کے درمیان تقابل کر رہا ہے۔ اس دنیا کو اور زندگی کو وہ ''ریڈی کیول'' (Redicule) کر رہا ہے کہ میں اس دنیا میں آیا ہوں ۔ میرا اس زندگی میں حاصل وصول کیا ہے ، وہ دو گھونٹ جو میں نے پیے ان کا خمیازہ کیا ہے؟ اور ازالہ کیا ہے ۔اس کے خیالات کی شکست بھی ہوسکتی ہے مجید امجد جیسا شاعر چھوٹی چیزوں میں بڑا مضمون بیان کرتا ہے ۔ اب جو دو آنکھیں ایک عام آدمی کے لیے روز مرہ کا تجربہ ہے ۔ مجید امجد اس میں بہت سارے اَن دیکھے امکانات دریافت کرتا ہے ۔ اب وہ ذرا حساب کتاب کی طرف آ جاتا ہے ۔ اب وہ کہتا ہے کہ میں بھی اس دنیا کا فرد ہوں ۔ اس دنیا کی مال و متاع میں اور خوشیوں میں میرا بھی حصہ ہے ۔ یہ دنیا ، جس کو ناز ہے ، اپنے پھیلاو پر ، جس کو ناز ہے اپنے وسائل کی فراوانی پر ، اس دنیا نے مجھے کیا دیا اور اتنی پھیلی ہوئی ، اتنی بڑی دنیا میں میرا حصہ کیا ہے؟ یہی دو سانس۔ یہ کائنات جس کے ایک چھوٹے سے حصے میں ہم مقیم ہیں ۔ اس کائنات کی ساری نعمتیں اور فضیلتیں جو ہیں ، وہ انسان کے لیے ہیں ۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں کائنات کا مرکز ہوں اور اگر یہ کائنات میرے لیے بنائی گئی ہے ۔ اس میں بطور ایک فرد کے میرا حصہ کیا ہے؟

اتنی وسیع کائناتوں میں میرا حصہ کیا ہے؟ اور اگر میرا حصہ نہیں ہے تو پھر اس کائنات کے ساتھ میرا رشتہ کیا ہے اس کے اوپر وہ ایک بنیادی سوال اُٹھا رہا ہے ،اس سے میرا تعلق کیا ہے؟ وہ انسان، کائنات اور وقت کی جو تقویم ہے ،ان کو مجید امجد شاعر محض ہے جو صورت حال کو جُوں کا تُوں بیان کر دے وہ بڑا سوچنے والا ذہین ہے ۔ اس کی شاعری احساس پر Base نہیں کرتی بلکہ سوال اُٹھاتی ہے اور بڑے سوال اُٹھاتی ہے ۔ یہی بڑی شاعری کا داعیہ ہوتا ہے کہ وہ صرف انٹرٹین (Entertain) نہ کرے بلکہ بڑی شاعری بڑے سوال پیدا کرے اور ایک بڑا منظر نامہ Create کرے ۔شاعر یہاں ایک بڑا سوال اُٹھاتا ہے کہ دنیا میں میرے قیام اور میری ساری تگ و تاز کا کوئی جواز بھی ہے؟:

کیا اسی واسطے ماضی کے بیختانوں سے اک موجِ حیات
اپنے ہمراہ لیے ناچتی گاتی ہوئی صدیوں کی برات
آ کے اس ساحلِ گُل پوش سے ٹکرائی ہے؟
کیا یہی مقصدِ صد عالمِ امکانی ہے
کہ جب اس سطحِ خروشندہ پہ ڈھونڈوں میں کوئی رختِ طرب
کوئی مکھ، کوئی نگہ، کوئی تبسم، کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آئے'' تو کیا ڈھونڈتا ہے
تیرا ساماں تو یہی بے سروسامانی ہے'' (۵)

یہاں وہ ایک بنیادی سوال اُٹھاتا ہے۔ کہ اگر فنا لازم ہے تو بقا کیا ہے؟ اور یہ کائنات کا سارا کھیل۔ ہم یہاں آئیں اور کھیل تماشا کر کے چلے جائیں پھر اس کائنات کا اپنا جواز کیا ہے، یہاں شاعر فلسفیانہ انداز سے ایک کلیدی سوال اُٹھاتا ہے۔

اس کائنات کا مقصد و مآل یہی ہے کہ یہ کائنات اتنے چھوٹے سے دائرے کے لیے بنائی گئی تھی۔ وہ تو کائنات کو اور اس کے پھیلے ہوئے نظام کو ایک وسیع مقصد اور بڑے کُرے میں دیکھتا ہے کہ یہ سوال بنیادی طور پر وجودی سوال بھی ہے۔

جیسے وجودیت والے کہتے ہیں کہ یہ کائنات صدیوں پرانی ہے اور صدیوں تک رہے گی۔ فرد کے لیے تو اس کائنات کا سفر لایعنیت شروع ہو جاتا ہے، جب وہ اس دنیا کا حصہ نہیں رہتا۔

اس اتنی وسعت والی دنیا کی سرگرمی اتنی چھوٹی اور محدود سرگرمی ہے کہ ایک فرد کے ساتھ شروع ہوا اور ایک فرد کے ساتھ ختم ہو جائے۔ وہ بنیادی وجودی سوال اٹھاتا ہے کہ 'فرد' کی اس وسیع و عریض کائنات میں Placement کیا ہے؟ اور اگر فرد غائب ہو جاتا ہے تو اس کی معنویت کیا ہے؟ فرد سے پہلے بھی کائنات موجود تھی اور اس کے بعد بھی موجود رہے گی۔

کائنات کے جملہ مظاہر میں تیرا سامان تو یہی بے سروسامانی ہے لمحۂ موجود سے اوپر اٹھ کر وہ خالقِ کائنات سے مکالمہ کرتا ہے۔ یہ دنیا اور اس دنیا کے مظاہر جب اس کے سوالوں کا جواب نہیں دے پاتے تو پھر کہیں سے اس کو آواز آتی ہے کہ اپنی اوقات میں رہ۔ تیرا اس کائنات میں اتنا ہی حصہ ہے اور تو اس سے زیادہ کا اہل اور مستحق نہیں ہے، تیری اتنی ہی اوقات ہے۔ اب دنیا پس پُشت چلی گئی ہے، اب خالق اور مخلوق کے درمیان مکالمہ شروع ہو گیا ہے۔

بڑا شاعر کسی ایک کیفیت کا اسیر نہیں ہوتا۔ بڑا شاعر بہت سارے مناظر بناتا ہے۔ بہت ساری Paintings بناتا ہے۔ اس میں اپنے قاری کو شریک کرتا ہے۔ انسان کا زندگی کے ساتھ جو رشتہ ہے، اس کی بے معنویت اور لایعنیت کو موضوع بناتا ہے۔ انسان اور زندگی کے درمیان جو تعلق کی نوعیت اور صورتِ حال ہے، اُس

کو دریافت کرتا ہے اور نتیجتاً انسان اور حیات کی بے معنویت اور لایعنیت کے پُر پیچ مقام پر آ کر اپنی حیرت کا اظہار کرتا ہے۔ اس مقام پر شاعر انسان کو بے سروسامان پاتا ہے۔ کتنا بلیغ مصرع ہے:

(تیرا ساماں تو یہی بے سروسامانی ہے)

ارادے پابہ زنجیر ہیں۔ اسیر ہیں۔ ارادے آزاد نہیں ہیں۔ ارادوں پر پہرے ہیں، لیکن ارادے اسیر ہوتے ہوئے بھی ارادوں کو آزادی نہیں، ارادوں کو روایات اور رسموں میں بند کر دیا گیا ہے۔ ان پر محدودات لگا دی گئی ہیں، لیکن ارادوں کے پیروں میں زنجیر ڈال سکتے ہیں، لیکن ارادوں کا جو خروش ہے، ان کو زنجیر نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے وہ ماضی میں لے گیا، جہاں اس نے اپنا تھوڑا سا حصہ وصول کیا۔ پھر اس نے حال کا منظر نامہ بیان کیا، جس میں اس کی آرزومندی والی اور مجوزہ دنیا چھن چکی ہے اور وہ ایک ایسی دنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے جس کا کوئی کردار نہیں ہے جو آسائشوں اور آلائشوں سے بھری ہوئی ہے لیکن اس کا وہ طلب گار نہیں۔ اب دونوں زمانوں کی سیاحت کے بعد وہ مستقبل کی طرف ایک جست لگاتا ہے اور اسے مستقبل میں بھی بہتری کی امّید نہیں:

کس کی فتراک میں ہیں عرشِ بریں فرشِ زمیں؟ کون کہے
پسِ صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں؟ کون کہے
جانے کن گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے
اتنے زخموں سے سجا کر دلِ بے تاب کی پژمردہ جبیں
کس نے بھیجا ہمیں اس جلتے ہوئے دیس میں؟ معلوم نہیں!
یوں نہ اپنے دمِ اُمید کو بہلائے کوئی،
کون کہتا ہے گلستاں میں بہار آنی ہے (۶)

وہ شاعر محض نہیں ہے کہیں وہ سماجیات سے کام لیتا ہے، کہیں فلسفے سے، کہیں اینتھرو پولوجی سے، کہیں وہ رومانویت سے کام لیتا ہے، کہیں وہ حُسن تضادات سے کام لیتا ہے۔ یہ اُس کی detachment یعنی عدم جُڑت ہے۔ ملال، رائیگانی اور مسترد کرنے کا جو پہلو نظر آ رہا ہے، یہ دنیا اور لمحہ موجود میرے کام کی نہیں۔ یہ دنیا جس میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اپنی ساری آسائشوں، ساری ترغیبات کے باوجود، یہ دنیا میرے لیے بے معنی ہے، اس لیے کہ جس دنیا کا میں نے خواب دیکھا تھا، جس دنیا کے ساتھ میں خود کو احساسی سطح پر اور جذباتی سطح پر منسلک کرتا ہوں، وہ مجھ سے چھن گئی ہے اور یہ دنیا جو میرے سامنے ہے، یہ میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ اب اس خلا اور اس تضاد کے درمیان وہ شعری کیفیات کو مرتب کر رہا ہے۔ مختلف کیفیات کو مرتب کر رہا ہے۔ یہ ساری نظم اس کے خوابوں کے درمیان اور اس کے موجود کے درمیان سفر کرتی ہے۔ خوابوں کی تلاش میں ہے جو اس سے چھن گئے۔ دنیا کی ترغیبات سے اسے محبت نہیں ہے۔ وہ اس دنیا کو اپنا موجود بنانا نہیں چاہتا۔ یہ دنیا جو کسی عام آدمی کے لیے ہزار طرح کے دام، ہزار طرح کی ترغیبات رکھتی ہے۔ یہ اسے پرِ کاہ کے برابر نہیں سمجھتا اور اس دنیا کو مسترد کرتے

ہوئے، وہ اپنے ان خوابوں کی تلاش میں ہے جو اس سے چھین لیے گئے لیکن اُس نے ان کی ایک جھلک اسے ضرور دکھائی گئی تھی ۔ ایک لمحہ اس کی زندگی میں ایسا ضرور آیا، جب اس کے خواب اس کی دسترس میں تھے ۔ جب وہ چھن گئے تو اب دنیا کی کوئی بھی چیز اس کی نظر میں نہیں ٹھہرتی ۔ اب وہ اپنے اسی عالم تصور جو اس کی دنیا ہے اسی سے اپنے وہ سارے خواب اور اپنی ساری آوازیں کشید کر رہا ہے ۔ یہ اس کا شعری اعجاز ہے وہ کیا وعدہ کیا لفظیات لاتا ہے، کیا اعلیٰ لُغت لاتا ہے ۔ کیا عمدہ مصرع سازی کرتا ہے ۔ مضمون تو وہی ہے مگر یہاں شاعر کا شعری جلال و جمال عدیم النظیر ہے ۔ یہ سارا اُس کا شعری شکوہ (Poetic Grandeur) ہے ۔

جی میں آئی ہے کہ اک بارِ غمِ زیست پہ احساں دھر کر
دیگِ گردوں میں اُبلتے ہوئے زہراب سے اک خُم بھر کر
(دیگِ گردوں کہ ابد زنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامۂ لافانی ہے)
اسی زہراب سے خُم بھر کے پٹخ دوں اُفقِ دوراں پر
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر
اب یہی دُھن ہے کہ اس ظُلمتِ بے پایاں کو
جو مری روح کے ایوان کی زندانی ہے
اُٹھ کے پھیلا دوں انھی اونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پر
انھی گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پر
اب ارادہ ہے کہ ان بس بھرے ارمانوں کو
جن کے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
سینۂ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں
(نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب) (۷)

درد مجرد نہیں ہے ۔ یہ اس کا اسٹائل بھی ہے کہ وہ جمع بنا کر بات کرتا ہے۔ یہ اس کی شاعری میں ملٹی شیڈز (Multi Shades) کیفیت کے لیے ضروری ہے ۔ مجید امجد کی شاعری اور اس کا شعری اظہار یک طرفہ نہیں ہے۔ لہٰذا چیزوں اور کیفیات کو جمع بنائے بغیر زندگی کی شدت اور اس کے پھیلاؤ کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا ۔ مجید امجد اشیا اور کیفیات کے پھیلاؤ کو ظاہر کرنے کے لیے درد کو دردوں بناتا ہے۔ روز مرہ زندگی میں واحد کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کو جمع کے صیغے میں لاتا ہے ۔ مجید امجد کے یہاں ’’درد‘‘ یک رُخا ’’درد‘‘ ہے اور کسی ایک کیفیت یا کمیت کا نام درد نہیں ہے بلکہ درد کے کئی شیڈز ہیں، غم کے کئی شیڈز ہیں ۔ اب وہ اس دنیا کے ساتھ گریز اور برات کا اعلان کرتا ہے اور اپنے اندر کی کڑواہٹ کو شعری پیراہن عطا کر رہا ہے ۔ یہ اُس کی Rejection ہے ۔ اس کے

نزدیک یہ دنیا جعلی بھی ہے اور یہ دنیا کوئی بڑی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ جیسا کہ اقبال نے کہا تھا:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو (۸)

(بال جبریل، اقبال)

مجید امجد کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی ایک کنویں کا مینڈک بن کر نہیں رہ جاتا۔ مجید امجد کے یہاں اگر ترقی پسندی بھی ہے تو وہ اس ترقی پسندی کو کُل کائنات اور کُل متاع نہیں بناتا۔ وہ جدیدیت کو بھی کُل متاع نہیں بناتا۔ وہ زندگی کو برسوں یا کیلنڈر میں بانٹ کر نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو زندگی کو اُس کی کُلّیت میں دیکھتا ہے، اُس کو جہاں سے روشنی ملتی ہے، وہ اسے کشید کرتا ہے۔ وہ آزاد فضا کے پرندے کی طرح کسی ایک خاص فضا کا اسیر نہیں رہتا۔ وہ اپنی آزادی برقرار رکھتے ہوئے، اسے جہاں سے اپنے مطلب کی چیز ملتی ہے، اس کو وہ اُٹھا لیتا ہے۔ وہ کسی کی اطاعت نہیں کرتا۔ اقبال محدود کیوں ہو گیا۔ اقبال بہت بڑا شاعر ہے۔ اس کے پاس بہت بڑا creative pedistle تھا۔ اس کے پاس بہت بڑا کرافٹ تھا، لیکن اقبال نے اپنی مذہبی للک میں یا مسلمانوں کی بیداری کی للک میں اپنے آپ کو ایک تنگنائے کا اسیر بنا لیا یا جب کہ مجید امجد اپنے آپ کو کسی ایک فضا تک محدود نہیں کرتا۔

یہ اس کا Rejection Crisis ہے، وہ اس سے اپنی برات کا اعلان کر رہا ہے۔ اب یہ اس کی نفرت ہے، اس کی Rejection اور اس کی برات سے مل کر ایک پورا منظر نامہ تشکیل پاتا ہے۔ اس کے ارمان زہریلے ارمان ہیں۔ یہاں مجید امجد جس چیز سے گریز کر رہا ہے یا جس چیز کی مذمت کر رہا ہے اور جس چیز کا ملال اور ماتم کر رہا ہے۔ وہ اس کا ذاتی ملال اور ماتم ہی ہے۔ شاعر نے اپنے ذاتی تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کائناتی تناظر میں ہر طرح کی ناکامیاں اور کامرانیاں معنویت سے محروم ہیں۔ یہ وہ انسان ہے جو دنیا کی اس ترغیب میں آنے سے انکار کرتے ہوئے اسے بھولے بھٹکے انسان تیری اصل منزل اور تیرا جو اصل ماحصل ہے، وہ یہ لحاتی ترغیبات نہیں ہیں۔ ایک ایسی دنیا ہے جو ان ساری آلائشوں سے پاک ہے۔ ایک دنیا ہے جہاں پر سچائی کی حکمرانی ہو۔ یہ اس کی یعنی مجید امجد کی موعودہ اور مجوزہ دنیا ہے، مجید امجد اُس دنیا کو اپنی ذاتی دنیا نہیں کہتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دنیا انسان کی کھوئی ہوئی میراث ہے۔ یہ انسان کا خواب ہے۔ یہ خواب مجید امجد کا ذاتی خواب نہیں ہے۔ نظم کے آخر تک آ کر وہ اس دنیا کی برات کا اعلان کر رہا ہے اور وہ اس دنیا کو رد کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی خواب کو اور اپنی ذاتی آرزوؤں کو انسانوں کا جہان آرزو بنا دیتا ہے۔ یہ مجید امجد کا شعری شکوہ ہے۔ اب وہ اپنے ملال کو کائناتی اور آفاقی ملال بنا کے پیش کرتا ہے۔ اپنے غم کو کائناتی اور آفاقی غم بنا کے پیش کرتا ہے اور دنیا کو Reject کر رہا ہے۔

چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اک عالم حیرانی ہے
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرّا اُٹھے
اب یہ ٹھانی ہے کہ جمتی ہوئی بوندوں کے یہ بے کل چھینٹے

تیز جھالوں کہ یہ چابک سے کہ جن کی زد پر
کبڑے رستوں کی تھکی پیٹھ کی عریانی ہے
یہ دھواں دھوپ ترائی، یہ دھواں دھار پہاڑوں کی فصیل
دور تک چوٹیوں اور بدلیوں کے دیس کی سرحدِ جمیل
برف سی بدلیاں، جن کے لبِ تر سے پیوست
برف کی چوٹیوں کی دودھیا پیشانی ہے
ہاں یہ سب سلسلۂ رنگ، یہ گہوارہ حُسن وفسوں
میں اُسے اپنی دُکھی روح کی ان راگنیوں سے بھر دوں
جن کی لہریں کبھی آنسوں ہیں، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ کبھی پانی ہے (۹)

یہاں بہت بڑے مشاہدے کا عمل دخل ہے۔ جن لوگوں کو زیتون کے جنگلوں میں جانے کا اتفاق ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہاں خوشبو کے علاوہ سکون کا بھی احساس ہوتا ہے، اس نظم میں زیتون کا جنگل ایک بڑی بھرپور کیفیت پیدا کرتا ہے۔ زیتون بنیادی طور پر امن اور آشتی کی علامت ہے۔ زندگی کی خوب صورتی اور سرشاری کی علامت ہے۔ شاخِ زیتون کو دنیا میں امن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ زیتون امنِ عالم کی علامت ہے۔ زیتون کی پتی کو امن کی پتی سمجھا جاتا ہے۔ زیتون کا درخت امن وسکون کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ وہ رستہ جو انسان کے لیے دُشواریاں ہی دُشواریاں پیدا کرے اور وہ رستہ جو انسان کی منزل گم کر دے۔ اس رستے کی مذمت کے لیے اور اس رستے کو شائستہ انداز سے گالی دینے کے لیے کُبڑے رستے سے بہتر کون سا استعارہ ہوسکتا ہے۔

مجید امجد کی خوبی یہ ہے کہ وہ استعاروں میں استعارے اور تلازموں میں تلازمے بناتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو مرکب در مرکب کر دیتا ہے۔ مجید امجد کی شاعری کا ایک وصف اس کی پیچیدگی بھی ہے۔ وہ اپنے شعری سروسامان میں گرہیں ڈالتا ہے اور قاری کو ہوم ورک پر آمادہ کرتا ہے۔ کُبڑا رستہ، تھکی ہوئی پیٹھ اور اس کی عریانی یہ مختلف کیفیات ہیں جو اس نے اپنے تنافر میں شدت پیدا کرنے کے لیے وضع کی ہیں اور شعری قرینے سے مختلف تلازمے بنائے ہیں۔ پیٹھ کے اوپر وزن بڑی دیر تک رہے تو پیٹھ تھک جائے گی ہے۔ اس کے ڈھکنے سے یا ڈھانپنے سے، اُس کا بھرم رہ جاتا ہے، پیٹھ کو عریاں کر دیا جائے تو پیٹھ کا بھرم سارا کُھل جاتا ہے۔ اُس نے رستے کی بھی، اس پیٹھ کی بھی جس پر یہ سارا جعل سازی اور مصنوعی پن کا بوجھ لدا ہوا ہے اور اس کی عریانی کی بھی، اس سے وہ اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں کی عریانی کی اس نے اپنے شعری استعاراتی نظام (Metaphor system) کے ذریعے مذمت کی ہے۔ یہ اُس کا شعری ہُنر ہے یا اسے اُس کا شعری اعجاز بھی کہا جا سکتا ہے۔

مجید امجد کے یہاں منظر نامہ نہ جامد ہوتا ہے، نہ یک رُخا ہوتا ہے، وہ موزیک بناتا ہے۔ بہت سارے مناظر سے ایک بڑا فریم بناتا ہے۔ اس فریم میں ایک فریم یہ بھی ہے، کہ جیسا کہ ایک خلاقانہ ذہن رکھنے والا فن کار ٹرین

میں سفر کر رہا ہے، جہاں مناظر بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں دریا آ جاتا ہے، کہیں ندی آ جاتی ہے اور وہ اسے خلاّ قانہ انداز سے خلق کرتا چلا جاتا ہے، یہ مسافر کے سفر کا حصہ ہے۔ اس کے مشاہدے کا حصہ ہے، اس کے تجربے کا حصہ ہے۔ یہ ساری کیفیات، یہ سارا اظہار اور یہ سارا بیانیہ، یہ اُس مسلسل سفر کے دوران رونما ہونے والے اور اس کی آنکھوں کے پردوں پر وارد ہونے والے مختلف فریم ہیں۔ جب ایک انسان ٹرین میں سفر کرتا ہے تو اسے پہاڑ بھی نظر آتے ہیں، اُسے کھیت کھلیان اور ندی نالے بھی نظر آتے ہیں۔ اسے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں تو ان کو ایک تخلیق کار نے جب بیان کرنا ہوتو ایک لمبے اور پُر پیچ سفر میں جو مناظر چہرہ بدل بدل کر اس کے سامنے آتے ہیں، ان مناظر کی اس نے تفصیل بیان کی ہے، یہ اس کی محاکات نگاری کا ایک انداز ہے۔ اس نے اسے سفر نامہ نہیں بنایا بلکہ اسے تخلیق کی ارفع صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ سفر نامہ نہیں لکھ رہا بلکہ وہ تو جھلکیاں دکھا رہا ہے۔ یہ سب جھلکیاں اس کے بڑے فریم والی تصویر کا حصہ ہیں۔ جیسے بہت سے رنگین کپڑوں کے جوڑنے سے ایک رلی بنائی جاتی ہے۔ وہ رَلی بن جاتی ہے تو وہ ٹکڑے اپنی انفرادیت کو اُس رَلی میں ضم کر دیتے ہیں۔ رَلی کی اجتماعیت میں وہ ٹکڑے اپنے آپ کو مجتمع کر دیتے ہیں۔ یہ بہت سارے مناظر چل رہے ہیں لیکن یہ ایک بڑے منظر نامے کا حصہ ہیں۔ ہوا کی لہروں پر راگ، راگنیاں سفر کرتی ہیں۔ یہ زندگی کی روانی کہ یہ زندگی ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ ایک مسافر اپنے سفر کے دوران بہت سارے بدلتے ہوئے منظر دیکھتا ہے اور ان بدلتے ہوئے منظروں کو وہ اپنے قاری کے ساتھ بھی شیئر کر رہا ہے، لیکن منظروں کے بدلنے سے سفر کی اکائی تو ایک ہی رہتی ہے۔ انسانی زندگی اور اس کے جتنے تلازمات اور لوازمات ہیں، یہ ان کا ایک شعری بیانیہ ہے:

کوئی غایت، کوئی منزل، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا؟
کوئی مشعل بھی نہیں کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے، گھٹا ٹوپ ہے، طوفانی ہے
بولو اے نغمہ سرایانِ تحیّر کدۂ کاہکشاں
میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں؟ (۱۰)

اس منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے اُس منظر نامے کو اس نے بے معنی اور بے ربط قرار دے دیا ہے بلکہ اس نے منظر نامے کو گونگا کر دیا ہے۔ سفر شاعری کے تخیل (Imagination) کے آگے، شاعری کی Rejection کے آگے منظر نامہ گونگا ہو کر رہ گیا ہے۔ اب جب منظر نامہ جو ہے، وہ متحرک نہیں ہے، سہما ہوا ہے، اس میں اب وہ ایک تخاطب پیدا کر رہا ہے۔ یہ ایک طنزِ ملیح ہے کہ جو اس کائنات کی خوب صورتی کے گُن گاتے ہیں جو اِس کے ثمرات کے بارے میں قصیدہ گو رہتے ہیں اور جو لوگ ظاہر بینی کی سطح پر زندگی میں سب کچھ کرتے ہیں۔ اب وہ ان سے مخاطب ہے کہ یہ ساری صورتِ حال دھوکے کی غمازی کرتی ہے۔ یہ سب دہرے معیار پر مشتمل ہے جو مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ یہ انسان کے ظاہر اور باطن میں ثنویت کے عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ تاریکی کا بھی

مظہر ہے۔جیسا کہ ساحر لدھیانوی نے اپنی ایک نظم میں مجید امجد ہی کی تقلید میں کہا ہے:

یہ کُوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لُٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں، کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں (۱۱) (چکلے: ۲۹)

اسی طرح مجید امجد کی ۱۹۳۸ء کی نظم ''شاعر'' کا ایک بند اور ساحر لدھیانوی کی نظم ''تاج محل'' کا ایک بند ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جہاں ساحر لُدھیانوی کے یہاں مجید امجد سے ایک والہانہ عقیدت کا پرتو دیکھنے بھی کو ملتا ہے۔:

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دُنیا
گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دُنیا
محبت کے دشمن سماجوں کی دُنیا
یہاں پر کلی دل کی کھلتی نہیں ہے
کوئی چق دریچوں کی ہلتی نہیں ہے
مرے عشق کو بھیک ملتی نہیں ہے(۱۲) (شاعر: ص۴۳)

اسی طرح ساحر کی نظم ''تاج محل'' پر مجید امجد کے اثرات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں،البتہ مجید امجد اپنے باطن میں غواصی کرتے ہیں، جب کہ ساحر کا انحصار داخل سے زیادہ خارج کی طرف محسوس ہوتا ہے:

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
مری محبوب! کہیں اور مِلا کر مُجھ سے (۱۳) (تاج محل: ۳۰)

ساحر لدھیانوی نے مجید امجد سے متاثر ہو کر ہی یہ کہا تھا۔ مجید امجد نے ساحر لدھیانوی سے بہت پہلے اپنی نظم ''شاعر'' میں یہ مضمون اپنے ڈھنگ سے بیان کر دیا تھا۔ساحر کے یہاں تہ داری نہیں ہے۔ وہ بیان کی سطح پر لطف و انبساط کا سامان کرتا ہے۔ وہ قاری کو زیادہ کھوج اور تلاش کا سامان فراہم نہیں کرتا۔

نظم تو یہاں مکمل ہو گئی ہے۔ اس سارے حصے کو نظم کے فریم سے الگ کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر چند کہ اس نے اس کو ضمیمے کے طور پر نظم کے آخر میں شامل کر دیا ہے، لیکن نظم تو اپنا معنیاتی دائرہ یہاں مکمل کر رہی ہے۔مجید امجد رجائیت کے رویوں اور جذبوں کا ترجمان بن کر اس کُرۂ ارض کو چہار سمت پھیلے ہوئے منظر نامے میں تلاش کرتا ہے کہ اس میں بنی نوعِ انسان کا کردار کیا ہے؟ اُس نے اِس دُنیا کو کس مرتب شُدہ آئین کی پیروی میں تعمیر کیا ہے، سنوارا ہے اور ترقی سے ہم کنار کرتے ہوئے، اِسے انسانوں کے رہنے کے قابل بنایا ہے۔مجید امجد کے

نزدیک انسان کی زندگی وہ منشور ہے جس کی بنیادوں پر دُنیا قائم ہے اور جس کے پہیوں پر دنیا چل رہی ہے۔ شاعر کے دل میں مسلسل اضطراب کی کیفیت اِس بات کی غمازی کرتی ہے کہ یہ دُنیا اگر خود اُس کی خواہشوں اور آرزوؤں کے سانچے میں نہ ڈھل سکی تو سُرور وانبساط تک رسائی نہ پا سکے گا۔ شاعر نے اُن لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو کُرۂ ارض کے منظر نامے میں خوشی کی تلاش میں بھٹکتے ہیں، کچھ موڑ راہ میں ایسے بھی آتے ہیں، جب اُن کی روح بے جان سی بجھی بجھی نظر آنے لگتی ہے مگر چُوں کہ شاعر فطری طور پر رجائیت کے رویوں اور جذبوں سے معمور ہے تو اسے مل رہا اور جو کچھ وہ چاہتا ہے کہ ہو، اُس کے امکانات اُسے نظر آتے ہیں۔ یہ اِمکانات اُسے مظاہرِ فطرت، آفتاب، ماہتاب، گھٹاؤں اور بے نور اُفق یعنی ہر سمت نظر آتے ہیں۔ اُسے اِمکانات کی اُمّید تو ہے، لیکن دل میں وسوسوں نے بھی سر اُٹھا رکھا ہے۔ اُس کا ذہن پراگندہ، اُس کے دل میں یہی درد ہے کہ دُنیا مثالی بن جائے، اُس بنی نوعِ انسان کے لیے کہ جس کے لیے اُسے تخلیق کیا گیا ہے۔ بعض اوقات وہ دُنیا کی مثالی تصویر اپنے ذہن میں بناتا ہے، جس میں وہ اپنی یادوں، تکلیفوں اور تمنّاؤں کے رنگ بھرتا ہے۔ اُس کے لیے یہ دُنیا ایک ایسا کینوس ہے، جس میں وہ رنگ بھرنے کا متمنّی ہے اور اُس نے مانی مُوقلم اپنی کانپتی اُنگلیوں میں تھام لیا ہے۔ اس امّید کے ساتھ کہ اِس دُنیا کے سنورنے، خوش رنگ ہونے اور اِس کے مکینوں کی آرزوؤں کی تصویر وہ بنا سکے گا اور اِس تصویر کے وُجود میں آنے کے واضح اِمکانات موجود ہیں۔ نظم کے آخری حصے میں شاعر نے ''نغمۂ کواکب'' کے زیرِ عنوان ستاروں کا نغمہ تخلیق کیا ہے جس سے شاعر کے کائنات سے متعلق فہم و ادراک کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مجید امجد کائنات کے بارے میں اپنی ایک فہم و بصیرت اور understandig رکھتے ہیں، مذکورہ نظم میں وہ سیاروں کے بارے میں اپنے قاری کو یہ جانکاری دیتے ہیں کہ سب اپنی اپنی جگہ متحرک ہیں مگر بے مقصدیت کی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ وہ انسان اور کائنات کے مظاہر کی بے مقصدیت کو نہ صرف دیکھتے ہیں بلکہ زندگی کی جبریت کو بھی تخلیقی پیرائے سے اُجاگر کرتے ہیں، باوجود اس ساری صورتِ حال کے انسانی زندگی اور کائنات کے جملہ مظاہر کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔ شاعر نظم کے آخر میں ''نغمۂ کواکب'' کا عنوان قائم کرتا ہے اور اُس کے بعد مزید ذیلی عنوانات قائم کر کے سیاروں کی تحرک سے عبارت صورتِ حال کو نہ صرف آئینہ کرتا ہے بلکہ کائنات کی بے مقصدیت و بے معنویت کو بھی اُجاگر کرتا ہے اور بالآخر ''کُرۂ ارض'' کی طرف آتا ہے اور انسانی زندگی ہی کو Constitution of World قرار دیتا ہے، جہاں نامعلوم تاریک انفس و آفاق، کالی گھٹائیں اور رقص کرتے ہوئے سایوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے یعنی یہ دنیا اُس کا جہانِ آرزو نہیں ہے، لیکن زندگی کو جھیلنا ہی ہے، یہ ساری معروضی صورتِ حال اُس پر اپنے رازہائے سربستہ کے ساتھ واضح ہے اور انسانی زندگی جس کا ظہور چمکتے ہوئے ماہتابوں کے Trasparent سینوں سے فلٹریشن کے عمل کے بعد ہوا ہے، جہاں سرد و گرم زمانہ سے آئے روز اُس کا سامنا ہوتا ہے، جہاں یخ ٹھنڈی موجیں بھی ہیں اور نیند کے خمار آلود جھونکے بھی ہیں اور اُن جھونکوں کی زد میں انسان کی زندگی مائل بہ سفر ہے، انسان محسوسات کی سطح پر اور اپنے دل میں انھی دُکھوں، مصائب و مسائل اور کی یادوں کے طلسم کو تازہ تر کر کے اپنی تمنّاؤں، آرزوؤں کے تصویر کدے یعنی تحرک سے عبارت انسانی زندگی اور کائنات کے جبر سے

معمور دُنیا میں زندگی گزارنے پر جو اُس کی منشا کی زندگی نہیں ہے، ایسی ہی زندگی گزارنے پر مجبور و مقہور ہے اور اُس کے سامنے حیات و کائنات اپنے تمام پہلوؤں، جہات اور رازوں کے متنوع رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور انسان پھر بھی اِس دُکھوں بھرے سماج میں جینے پر مجبور ہے۔ اِس ساری جبریہ صورتِ حال کے باوجود اُس کی زندگی تحرک، تخلیق اور تعمیر و ہنر مندی کے رنگا رنگ پہلوؤں سے تعبیر و عبارت ہے اور اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ شاعر نے نظم کے آخری حصے میں مریخ کے دو چاند متحرک دکھائے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یورینس اور پلوٹو کی حرکیات کو دکھایا ہے مگر ایک فرد کی ناکامیوں اور کامیابیوں کو کائناتی تناظر میں معنویت سے عاری دکھایا ہے۔ مذکورہ صورتِ حال شاعر نے اپنے ذاتی تجربے کے نتیجے میں خلق کی ہے، وہ اپنے ذاتی ملال اور رائگانی کو کائناتی یا آفاقی رائگانی یا ملال بنا کر portray کرنے پر مکمل طور پر قُدرت رکھتا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) مجید امجد، **کلیاتِ مجید امجد**، مرتب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء) ص ص ۲۸۶، ۲۸۷
(۲) ایضاً، ص ۲۸۸
(۳) ایضاً، ص ۲۸۹
(۴) ایضاً، ص ۲۹۰
(۵) ایضاً، ص ۲۹۱
(۶) ایضاً، ص ص ۲۹۱، ۲۹۲
(۷) ایضاً، ص ص ۲۹۲، ۲۹۳
(۸) محمد اقبال، **کلیاتِ اقبال** (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۴ء) ص ۱۱۳
(۹) مجید امجد، **کلیاتِ مجید امجد**، مرتب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ص ۲۹۳، ۲۹۴
(۱۰) ایضاً، ص ۲۹۴
(۱۱) ساحر لُدھیانوی، **کلیاتِ ساحر** مرتب محمد یونس حسرت، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن، ص ۲۹
(۱۲) مجید امجد، **کلیاتِ مجید امجد** مرتب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۴۳
(۱۳) ساحر لُدھیانوی، **کلیاتِ ساحر** مرتب محمد یونس حسرت، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن، ص ۳۰

مآخذ:

☆ امجد، مجید۔ **کلیاتِ مجید امجد**۔ مرتب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء
☆ اقبال، محمد۔ **کلیاتِ اقبال**۔ لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۴ء
☆ لُدھیانوی، ساحر۔ **کلیاتِ ساحر**۔ مرتب محمد یونس حسرت۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن